اسلام کے تاریخی ارتقاء کی نوعیت

پروفیسر عبدالحمید صدیقی

جس طرح ایک ہی منبع سے جاری ہونے والے دریا اپنی گزرگاہوں کی نوعیتوں میں اختلاف کی وجہ سے اپنی رفتار، اپنی وسعت اور اثرات میں ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتے ہیں بالکل اسی طرح ایک ہی سرچشمہ سے پھوٹنے والے ادیان ماحول اور تاریخی عوامل کے فرق کی وجہ سے روح اور مزاج کے اعتبار سے نہ سہی، مگر دائرۂ عمل کے لحاظ سے ضرور ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ کسی مذہب کے اندر تجدید و احیائے دین کی کوئی تحریک لے کر اٹھے ہوں انہیں ان تاریخی عوامل اور ارتقاء کے اس نہج پر پوری طرح نگاہ رکھنی چاہیے۔ کیونکہ اس پس منظر کو ذہن نشین کیے بغیر تجدید کی نازک ذمہ داریوں کو کماحقہٗ سمجھا نہیں جا سکتا۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہم یہاں ایک امر کی وضاحت نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ یُوں تو زندگی کا ہر نظام مختلف اقدار کے باہمی امتزاج سے معرضِ وجود میں آتا ہے، لیکن مذہب کا تو سارا دارو مدار ہی اس امتزاج کے ایک خاص تناسب پر ہے۔ اس تناسب میں معمولی سی تبدیلی مذہب کے پُورے نظام کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے، اسلامی نظامِ حیات کا کونسا شعبہ ایسا ہے جس کے واضح نقوش دوسرے نظام ہائے حیات میں نہیں ملتے۔ کسبِ معاش کی ترغیب، خرچ کے معاملے میں احتیاط کی ہدایت، والدین، بیوی، اولاد اور پڑوسیوں کے حقوق ادا کرنے کی تلقین، اپنے جسم کے تقاضوں کو یکسر نظر انداز کرنے کی ممانعت غرض زندگی کا وہ کونسا ایسا شعبہ ہے جس کا کوئی نشان غیر اسلامی تہذیب میں نہ پایا جاتا ہو۔ لیکن اس کے باوجود اسلامی نظامِ حیات اور غیر اسلامی تمدنوں کے درمیان ہم بنیادی

اور اساسی فرق دیکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مظاہرِ حیات میں مماثلت روح اور مزاج کی ہم آہنگی پر ہمیشہ دلالت نہیں کرتی۔ صرف چند گوشوں میں اشتراک کے بعض پہلو دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ روح کے اعتبار سے بھی ایک ہی ہیں۔ ایک تہذیب کو جو چیز دوسری تہذیبوں سے ممیز اور ممتاز کرتی ہے وہ اس کے مظاہر نہیں ہوتے بلکہ اُس تہذیب کا وہ نظامِ اقدار ہے جو وہ اپنے اساسی تصور اور اپنی مخصوص رُوح اور مخصوص مزاج کے مطابق زندگی کے مختلف شعبوں کے درمیان ایک خاص نہج پر قائم کرتی ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ دو تہذیبوں کے بعض مظاہر ایک دوسرے سے ملتے ہوئے نظر آئیں۔ لیکن اگر ان تہذیبوں کے اساسی تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہوں تو رُوح اور مزاج کے اعتبار سے اُن میں کبھی ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جس بنیادی تصور کے رُخ زیبا کے یہ عکس ہیں اُس میں بُعد اور بیگانگی پائی جاتی ہے۔ آپ کسبِ معاش ہی کو لیجیے اور دیکھیے کہ اسلامی اور مغربی تہذیب کے درمیان معاشی جدوجہد کے بعض پہلوؤں میں بظاہر اشتراک ہونے کے باوجود مقصد اور دائرۂ کار میں کتنا بنیادی اختلاف پایا جاتا ہے۔ مغربی تصور کے مطابق اس جدوجہد کی غایت صرف اسی قدر ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ دولت کمائی جائے۔ لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے یہ جدوجہد عبادت کے زمرے میں داخل ہے اور اس کا منتہائے مقصود باری تعالیٰ کی رضا جوئی ہے۔ اس لیے اس دائرۂ عمل میں وہ بعض اخلاقی حدود کا پابند ہے۔

ان گزارشات سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو گئی ہو گی کہ کسی تہذیب کا مدار اُس کے مظاہر پر نہیں ہوتا بلکہ اُس کی رُوح اور اُس کے اُس نظامِ اقدار پر ہوتا ہے جس کے مطابق اُس کے مختلف شعبوں کے درمیان ربط پیدا کیا جاتا ہے۔ اس لیے تجدید و احیائے دین کے علمبرداروں کو اس نظامِ اقدار کے معاملے میں غیر معمولی حد تک محتاط ہونا چاہیے، کیونکہ اگر انہوں نے مختلف تہذیبوں کے مظاہر میں یگانگت پاکر تہذیبی رُوح کے فرق سے قطع نظر کرتے ہوئے کسی دوسری تہذیب کے طریقوں کو اختیار کر لیا تو اس سے اقدار کا پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور ان ستونوں کے گرنے سے تہذیب کی پوری عمارت پیوندِ خاک ہو جائے گی۔

اگر آپ مسلمانوں میں پھیلی ہوئی فکر و عمل کی مختلف گمراہیوں کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ساری برائیاں ہماری اسی غفلت کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں سرایت کرتی چلی جا رہی ہیں۔ ہم نے جہاں کہیں دوسرے نظامِ حیات میں کوئی ایسی چیز دیکھی جس کی کوئی صورت ہمارے ہاں بھی پائی جاتی تھی تو اسے جوں کا توں اپنانے کی کوشش کی، اور اگر اس راہ میں قرآن و حدیث کے واضح احکام بھی حائل ہوئے تو انہیں یا تو نظر انداز کر دیا یا ان کی ایسی تاویل پیش کی جس سے وہ ان کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کے مخالف ہونے کے بجائے اُن کے مؤید ہو جائیں۔ اگر آپ ان سطح بین اور ذہنی اعتبار سے مغلوب لوگوں کے کارناموں پر نگاہ ڈالیں تو آپ کے لیے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہ ہو گا کہ انہوں نے تجدید و احیائے دین کے نام پر دین کے ساتھ دانستہ یا نادانستہ ایک ایسا شرمناک کھیل کھیلا جس سے وہ انسانیت کے لیے نورِ ہدایت ثابت ہونے کے بجائے مُرغِ باد نما بن کر رہ گیا جسے غیر اسلامی افکار و نظریات کے تھپیڑے ہر وقت اپنی منشا اور مرضی کے مطابق گھماتے رہیں۔ یہ تو محض اللہ کا احسان ہے کہ علمائے ربانی نے ان تجدد پسندوں کی کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا، ورنہ آج اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہونے کے بجائے اسی طرح کا ایک بے جان اور غیر مؤثر ضمیمۂ زندگی ہوتا جس طرح مسیحیت، یہودیت، بدھ مت، ہندو مت یا اس طرح کے بعض دوسرے مذاہب ہیں۔

ماضی میں ان تجدد پسندوں نے کن باطل افکار کو اسلام میں داخل کرنے کی کوششیں کیں اور کس طرح اللہ کے پاکباز بندوں نے اُن کی ان مذموم کوششوں کو ناکام بنا دیا، یہ ایک طویل داستان ہے جسے یہاں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہم یہاں بطورِ مثال دورِ جدید کی بعض کوششوں کا ذکر کرتے ہیں جن سے تجدد پسندوں کے اندازِ فکر اور دین کے لیے اُس کے خطرناک نتائج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے

ہمارے ہاں جس عہد میں مغربی تہذیب کا ریلا آیا اس وقت یورپ میں سائنس کو بڑا عروج حاصل تھا۔ فطرت کو لوگ خدا سمجھ کر اس کی بارگاہ میں جبینِ نیاز جھکا رہے تھے۔ اس کے انکشافات پر انہیں اتنا ہی غیر متزلزل یقین تھا جتنا کہ کسی خدا پرست کو وحی و الہام پر ہوتا ہے۔ اُس کے

قوانین کو وہ قوانینِ شریعت سے زیادہ صحیح اور مستحکم سمجھتے تھے۔ چنانچہ ہماری ملّت کے وہ افراد جو غالب تہذیب سے مرعوب تھے انہوں نے اَنفُس و آفاق پر غور کرنے کی قرآنی دعوت کو، اور بعض مسلمان سائنس دانوں کے کمالات کو دلیل بنا کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ اسلام قوانینِ فطرت کی پابندی ہی کا دوسرا نام ہے اور اس کے نتیجے میں ہر اس چیز کی نفی کر دی جو ان قوانین سے ہم آہنگ نہ تھی معجزات، وحی، فرشتے، جن، دوزخ، جنت، حشر و نشر، غرض وہ سارے عقائد جن کی تائید مشاہدہ اور تجربہ سے نہ ہو سکتی تھی، اُن کا یا تو واضح طور پر انکار کر دیا گیا یا اُن کی ایسی تاویل کرنے کی کوشش کی گئی جو صریح طور پر تحریف کے ذیل میں آتی ہے۔

اسی طرح جب مغرب میں سرمایہ داری کو فروغ حاصل ہُوا اور اس کی توسیع و ترقی کے لیے جمہوری فضا مہیا کرنے کی ضرورت پیش آئی، تو ہمارے تجدد پسند طبقوں نے اس حقیقت کو سوچے بغیر کہ یہ مغربی جمہوریت کس روح کی مظہر ہے، اور اس کے پیچھے کس نوعیت کے لادینی تصورات کار فرما ہیں، اور اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت میں کیا بنیادی اختلافات ہیں، یہ کہنا شروع کر دیا کہ مغرب کا جمہوری نظام، جس میں پُورا معاشرہ چند افراد کے مفادات پر بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے، اسلام کے سیاسی نظام کا ایک چربہ ہے۔ یہی مرعوبانہ ذہنیت ہمیں بہت سے دوسرے معاملات، مثلاً سُود، انشورنس، ضبطِ ولادت، تعدد ازدواج اور اسی طرز کے سینکڑوں مسائل میں نظر آتی ہے۔ اسلام نے کاروبار میں منافع کے لیے جو جواز رکھا ہے اُسے آڑ بنا کر سُود کو جائز بنانے کی کوشش کی گئی۔ آفات ناگہانی کے معاملے میں اسلامی ریاست کی ذمہ داری، اور بے یار و مددگار افراد کی کفالت کے اسلامی تصور پر انشورنس کے جواز کا فتویٰ دیا گیا۔ یہ تھا وہ انداز جس کے تحت مغربی تہذیب کا اسلامی نظامِ حیات میں پیوند لگانے کی باقاعدہ جد و جہد ہوئی۔

لیکن یہ حیرت انگیز بات ہے کہ تجدد پسندوں کے غیر معمولی وسائل، مغربی تہذیب کی چکا چوند روشنی، اور اسلامی تمدن کے اضمحلال کے باوجود ان لوگوں کو اپنے مقصد میں قطعاً کامیابی نہ ہوئی اور اُمّت کے اجتماعی ضمیر نے ان لوگوں کے اجتہادات کو ایک لمحہ کے لیے قبول کرنا

تو درکنار ان پر سوچنا تک گوارا نہ کیا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر تاریخ کے ایک طالب علم کے ذہن میں بالکل قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تجدّد پسندوں کے فتنوں سے دوسرے مذاہب نہ بچ سکے اور غالب تہذیبوں کے نہ صرف اجزا بلکہ ان کی رُوح تک اُن میں شامل ہوگئی جس نے ان مذاہب کی امتیازی حیثیت کو ختم کر کے رکھ دیا، تو اسلام آخر ان "مصلحین" کی دستبرد سے کیونکر محفوظ رہا؟

اس کا ایک سیدھا سادھا جواب تو یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کی حفاظت کا خود ذمہ لیا ہے اس لیے کسی فتنہ جُو کی فتنہ سامانی اس کے اندر کوئی رخنہ نہیں پیدا کر سکتی لیکن اس کے ساتھ ساتھ باری تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھنے کے لیے کچھ خاص اسباب بھی پیدا کیے ہیں۔ ان صفحات میں ہم انہی اسباب کی نشاندہی کریں گے۔

اسلام کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں دونوں مرکزِ نقل یعنی کتاب اللہ اور جس مقدس اور برتر ہستی پر یہ کتاب نازل ہوئی تھی اور جسے اس کی عملی تعبیر کے لیے باری تعالیٰ نے بطور نمونہ پیش کیا تھا، اُس کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک گوشہ اور اُس کی پیش کردہ تصریحات کا ایک ایک حرف پُوری طرح محفوظ ہے۔ یہ امتیاز کسی دوسرے مذہب کو حاصل نہیں۔ اول تو اُن کے صُحُفِ آسمانی کے متعلق یہ بات ہی یقین اور وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ یہ ہر قسم کی تحریف اور تبدیلی سے یکسر پاک ہیں۔ کیونکہ اُن میں کافی حد تک آمیزش موجود ہے اور بعض الہامی کتب ایسی بھی ہیں جن کا اصل متن ہی غائب ہے اور سارا انحصار محض تراجم پر کیا جا رہا ہے۔ پھر خدا کے جن پاک بندوں پر یہ الہامی کتابیں نازل ہوئی تھیں، اُن کی زندگی کے بہت سے پہلو ہماری نظر سے مستور ہیں۔ اس کے علاوہ جو پہلو معلوم و معروف ہیں اُن کے بارے میں بھی قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اُس میں قیاسات اور لکھنے والے کے ذاتی میلانات کا بڑا عمل دخل ہے۔ دنیا کی کوئی دوسری ایسی قوم نہیں گزری جس نے اپنے پیغمبر اور ہادی کی پُوری زندگی کو اس اہتمام سے محفوظ کیا ہو جس طرح کہ مسلمانوں نے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کو

محفوظ کیا ہے۔

سیدنا مسیح علیہ السلام کے پرستاروں کی دنیا میں کتنی کثیر تعداد موجود ہے۔ لیکن آج تک وہ اُن کی سیرت کا کوئی ایسا مرقع پیش نہیں کر سکے جو تاریخی اعتبار سے مستند بھی ہو اور جامع بھی۔ اِس حقیقت کا اعتراف خود مسیحیت کے گرم جوش علمبرداروں تک نے کیا ہے:

"ہمارے سامنے حضرت مسیح علیہ السلام کی پاکیزہ زندگی کے ایک حصے کے بھی صرف چند ہی پہلو بے نقاب ہوتے ہیں۔ تین سال کی بھرپور زندگی جس کی تیاری میں تیس سال صرف ہوئے، اس کی کون پردہ کشائی کر سکتا ہے۔ ہم اس ذات کے بارے میں صرف اسی قدر واقفیت رکھتے ہیں کہ اُس کی وجہ سے ایک نہائی دنیا روحانی اعتبار سے بیدار ہوئی، اور اب بھی اُس کے حیات آفریں اثرات موجود ہیں اور رہیں گے ——— ایک مثالی زندگی جس سے ہم بہت قریب ہونے کے باوجود دُور ہیں۔ لیکن اس مقدس زندگی کا کتنا حصہ ایسا ہے جس کے بارے میں ہمیں کچھ معلومات ہیں؟ مثلاً اُن کی والدہ محترمہ کے حالات، اُن کی گھریلو زندگی، اُن کے بچپن کے ساتھی اور اُن کے ساتھ اُن کے تعلقات۔ اُن کے روحانی مشن کے تدریجی طلوع یا یک بیک ظہور کی نسبت بھی ہم کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ ہمارے ذہن میں اُن مسائل کے متعلق کتنے سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں جو لاینحل ہی رہتے ہیں اور ہمیں ان کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملتا۔ مگر اسلام میں ہر چیز ممیز اور ممتاز ہے۔ یہاں کوئی دھندلا پن اور راز نہیں۔ . . . یہاں دن کا اُجالا ہے جس میں ہر چیز روشن ہے اور جس سے ہر فرد مستفیض ہو سکتا ہے[1]"

مسلمانوں نے ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات جس حزم و احتیاط سے جمع کیے اور اس معاملے میں جو کاوش انہوں نے کی اُس کی نظیر دنیا کی مذہبی تاریخ میں نہیں ملتی۔ انہوں نے

---

[1] BOSWORTH SMITH, MOHAMAD AND MOHAMMADANISM

واقعات کو قلمبند کرنے کے لیے یہ اشد ضروری سمجھا کہ سب سے پہلے ان واقعات کے راویوں کے حالات کا اچھی طرح جائزہ لیا جائے۔ اس کے لیے سب سے پہلا اصول یہ پیشِ نظر رکھا گیا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریک واقعہ تھا اور اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام درمیانی کڑیوں کی نام کی تصریح کے ساتھ صراحت کی جائے۔ اس کے ساتھ اس بات کی بھی پُوری طرح چھان بین کی جائے کہ جو حضرات سلسلۂ روایت کی مختلف کڑیوں کو ملا رہے ہیں وہ کیسے ہیں۔ دیانت اور امانت میں اُن کا کیا معیار تھا؟ اُن کے مشاغل کیا تھے؟ اُن کا چال چلن کیا تھا؟ سمجھ بوجھ اور فہم و ادراک کیسا تھا؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ؟ عالم تھے یا جاہل؟ اتنی چھوٹی چھوٹی جزئیات تک کا پتہ لگانا کسی اعتبار سے بھی جوئے شیر لانے سے کم صبر آزما کام نہ تھا لیکن سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اس کام میں صرف کر دیں۔ ایک ایک شہر میں گئے، ایک ایک گاؤں میں گھومے، جگہ جگہ ایسے افراد کو تلاش کیا جو حضور سرور کائنات کے بارے میں کوئی مستند بات اپنے پاس رکھتے ہوں۔ پھر خود اُن کے متعلق بھی ہر قسم کے حالات دریافت کیے تاکہ ان کے معتبر ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کیا جا سکے۔

یہ خدا کے اُن پاکباز بندوں کی سعی و جہد ہی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں اسماء الرجال کا وہ عظیم الشان فن ایجاد ہُوا جس کی کوئی دوسری مثال ہمیں تاریخِ عالم میں نہیں ملتی۔ مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر، جس کی نگرانی میں حافظ ابن حجر کی مشہور کتاب اصابہ فی احوال الصحابہ طبع ہوئی، نے اس حقیقت کو وانشگاف الفاظ میں تسلیم کرتے ہوئے کہا ہے:

> "کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں گزری اور نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ افراد کا حال معلوم کیا جا سکتا ہے۔"

ایک طرف قرآن مجید کے پورے متن کی، جس میں نہ صرف الفاظ بلکہ حروف اور شوشے تک شامل ہیں، مکمل حفاظت، اور دوسری طرف حضور سرورِ کائنات کی حیاتِ طیبہ کے

مستند ریکارڈ کی موجودگی، یہی دو چیزیں وہ ہیں جنہوں نے اسلام کو ہر قسم کے فتنے سے بچایا ہے

میری ان گزارشات کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام پر فتنہ پردازوں نے یورش نہیں کی۔ اللہ کے دین پر مفسدین نے بڑے منظم حملے کیے اور بسا اوقات دین کے بعض خیر خواہوں نے حالات سے متاثر بلکہ مرعوب ہو کر دین میں ایسی تبدیلیاں کرنے کی کوششیں کیں جن کے ذریعہ اُن کی دانست میں یہ وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو جاتے۔ لیکن کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی موجودگی میں نہ تو مفسدین کی کوششیں بار آور ہو سکیں اور نہ نیک نیت تجدّد پسندوں کو اپنے مقصد میں کوئی کامیابی نصیب ہوئی۔ قرآن حکیم اور سنتِ نبوی نے زبردست حصار کا کام دیا اور کسی فتنے کو اسلام کے اندر راہ پانے کا موقع نہ مل سکا۔ مارٹن لوتھر سے کہیں زیادہ ذہین و فطین، اس سے کہیں بڑھ کر جوش اور ولولہ رکھنے والے انسان، حکومت کی سرپرستی کے باوجود اسلام میں کوئی معمولی سا تغیر و تبدل بھی پیدا نہ کر سکے۔ اگر آپ کو ان حضرات کی ناکامیوں کا جائزہ لینا مقصود ہو تو آپ صرف چند پہلوؤں پر غور کر کے دیکھیں کہ انہیں کس قدر شکست فاش کھانی پڑی ہے۔

یورپ میں جب سرمایہ داری کا عروج ہوا تو یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ یہ نظام سود کے بغیر کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اہلِ کلیسا نے اس کے جائز ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا اور اہلِ یورپ نے اُسے شرح صدر کے ساتھ اپنا لیا۔ اور یہ چیز اُن کے خمیر میں اب اس طرح داخل ہو گئی ہے کہ انہیں کبھی اس بات کی خلش تک محسوس نہیں ہوتی کہ وہ اس حرام شے کو کھا رہے ہیں جسے ان کا دین بھی حرام کہتا ہے۔

اس کے مقابلے میں مسلمانوں کے معاملے کو دیکھیے تو آپ کو بالکل مختلف صورتِ حال نظر آئے گی۔ مسلمانوں کا شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو گا جو سود کی لعنت سے بالکل محفوظ ہو۔ ان ممالک کے تاجروں اور صنعت کاروں کی عظیم اکثریت بنکوں کے ذریعہ تجارت کرتی اور کاروبار چلاتی ہے۔ ان کی حکومتیں بھی سود پر اپنا سارا مالی نظام چلاتی ہیں۔ مغربی تہذیب کی

بلغار نے ان کے اندر یہ عزم اور ہمت ہی نہیں چھوڑی کہ وہ اس کے اثرات کو نظر انداز کر کے کوئی ایسا معاشی نظام قائم کر سکیں جس میں سُود کا کوئی عنصر شامل نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے جو حوصلہ، جو حکمت و اجتہاد، جو مومنانہ فراست اور اسلام سے جو والہانہ محبت درکار ہے، وہ اُن حضرات میں بالکل مفقود نظر آتی ہے جو مسلمان ملکوں میں اس قسم کا نظام قائم کرنے کے لیے قوت اور وسائل رکھتے ہیں۔

مزید براں خود مسلمانوں کے اندر ایک نہیں، متعدد ایسی نامور شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں جنہوں نے سُود کے بارے میں مسلمانوں کے احساسات اور تصورات کو بدل ڈالنے کی بھرپور کوششیں کی ہیں۔ اُن میں اصحابِ علم، سیاستدان، رہنما اور ملت کے بڑے بڑے دردمند شامل ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو مختلف حیلوں بہانوں سے یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ یہ وہ سُود ہے ہی نہیں جسے اسلام نے حرام کیا ہے لہٰذا اسے بطیبِ خاطر قبول کر لینا چاہیے۔ کسی نے دارالاسلام اور دارالحرب کے درمیان تفریق کی بنیاد پر متحدہ ہندوستان میں سُود کے جواز کا فتویٰ دیا۔ کسی نے یہ کہکر اسے حلال قرار دیا کہ کاروباری ضروریات کے لیے جو روپیہ لیا جائے اُس پر منافع کی مقرر شرح سُود کے ذیل میں سرے سے آتی ہی نہیں۔ کسی نے مسلمانوں کی مفلسی اور غربت کے پیشِ نظر اسے اضطرار کے زمرے میں شامل کر کے اس کے لینے اور دینے کے لیے قوم کو کھلی چھوٹ دینے کی کوشش کی لیکن ان سب حضرات کی کوششیں بالکل رائگاں گئیں۔ امت کے اجتماعی ضمیر نے آج تک اس بات کو تسلیم نہیں کیا کہ سُود کا موجودہ نظام جائز ہے اور اسے اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ مسلمانوں کی ۹۹،۹ فیصد آبادی اُسے آج بھی اُسی طرح حرام سمجھتی ہے جس طرح کہ خود شارح علیہ السلام نے اُسے حرام قرار دیا تھا۔

سُود تو خیر بڑی چیز ہے۔ تصویر جس سے آج مسلمان ممالک کے بیشتر اخبارات مزیّن ہیں، جس کے بغیر کوئی اشتہار مکمل نہیں ہوتا، جو ہماری زندگی کے اندر ایک ضروری عنصر کی حیثیت سے داخل ہوگئی ہے، اس کے بارے میں بھی اگر آج مسلمانوں کے ضمیر کو ٹٹولا جائے تو

معلوم ہو گا کہ وہ اسے کوئی پسندیدہ چیز نہیں سمجھتا بلکہ ایک ایسی بُرائی خیال کرتا ہے جسے اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے، لیکن محض غفلت کی وجہ سے مسلمان اُس میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

آپ مسلمانوں کو بدعملی اور غفلت کے جس قدر طعنے دیں آپ حق بجانب ہیں لیکن اس بدیہی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلم قوم کے احساسات اُس کے خوب و ناخوب کے پیمانوں، اُس کے حلال و حرام کے امتیازات، اور نیکی اور بدی کے تصورات میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ جن چیزوں کو اُس کے ہادی برحق نے ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ وہ آج بھی اُس کی نظر میں ناپسندیدہ ہیں اور کوئی فلسفہ، کوئی منطقی استدلال، کسی بڑے سے بڑے نامور مفکر کی رائے، مسلمانوں کی فکر و نظر کے زاویوں یا اُن کے اجتماعی احساسات کو بدل نہیں سکی۔

اسلام کے اس روشن اور امتیازی پہلو پر آپ جتنا زیادہ غور کریں گے اتنی ہی یہ حقیقت منکشف ہوتی چلی جائے گی کہ اسلامی نظامِ حیات کی زندگی اور اُس کی پائیداری کا سب سے بڑا راز اس بات میں مضمر ہے کہ مسلمانوں کے پاس اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی سنّت جوں کی توں محفوظ ہیں۔ اگر محض کتابِ الٰہی ہوتی اور سنّتِ رسول موجود نہ ہوتی تو پھر یہ بات عین ممکن تھی کہ دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں بھی من مانی تاویلات کے دروازے کھل جاتے۔ لیکن سنّت نے ان سارے دروازوں کو مسدود کر دیا ہے، کیونکہ مسلمان کے نزدیک قرآن مجید کی کوئی ایسی تشریح قابلِ قبول نہیں ہو سکتی جس کی تائید سنّتِ نبوی سے نہ ہوتی ہو۔ یہی اسلامی تہذیب و تمدن کا سب سے نمایاں اور امتیازی پہلو ہے اور غالباً اسی وجہ سے مستشرقین تک اس کا ذکر کرتے ہوئے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ خود کفیل اور جامع تہذیب ہے۔